باب۔۱۵

تمہید
فص عیسویہ

روح کیا ہے۔۔؟ حیات و علم و قدرت کی اصل اور ان کا مرکز۔۔۔ اس لفظ کے مادے میں حرکت و فعل ہے۔ آؤ ذرا غور کریں کہ ہمارے جسم میں منبعِ حیات (اور) حس و حرکت کیا ہے۔؟ دماغ سے اعصاب میں حس و حرکت پہنچتی ہے، اور قلب سے حیات۔۔۔ دماغ و قلب میں حیات کا مرکز کیا ہے۔؟ تمام خون سے ایک لطیف بخار قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ جب تک وہ لطیف بخار جسم میں رہتا ہے حیات بھی ہے، حس و حرکت بھی ہے۔ جہاں وہ بخارِ لطیف نہ رہا بس موت ہے۔ یہ بخار کتنا ہی لطیف ہو مگر ہے مادّی۔ غریب مادّے میں حس و حرکت کہاں۔ ارادہ کدھر۔ علم سے اس کو کیا علاقہ۔۔۔! مادّے کے لوازم و صفات سے استمرار (یعنی ٹھیراؤ اور استقلال) ہے، یعنی جب تک (اسے) کوئی خارجی قوت متحرک نہ کرے، متحرک نہیں ہوتا، اور جب تک کوئی خارجی قوت ساکن نہ کرے (یہ) ساکن نہیں ہوتا۔۔۔ پھر بھلا حرکتِ ارادی مادّے میں کہاں سے آئی۔۔؟ ضرور کسی غیر مادّی شئے سے۔ یہ بخارِ لطیف جس کو عربی میں "نسمہ" کہتے ہیں، اس غیر مادّی شئے کا گھوڑا یا آلہ یا معمول ہے۔ ہر ایک ہپناٹزم والا (اور) ہر اسپری چول (spiritual) جانتا ہے کہ روح ایک غیر مادّی شئے ہے۔

اچھا ذرا اس پر بھی غور کرو کہ خواب میں تم خود کو بھی دیکھتے ہو، اپنے دوستوں سے بھی ملتے ہو۔ بعض مستقبل کی بھی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، حالاں کہ عالم شہادت میں اس دنیا میں حال کے سوا مستقبل ہرگز معلوم نہیں ہوتا۔ ضرور یہ غیر مادّی عالم کا تماشا ہے۔

اچھا تو خواب میں صورت شکل اور دوسری چیزیں مثلاً بات چیت کرنا، چلنا پھرنا، سب ہوتا ہے، تو کیا تم آفتاب کے نور سے دیکھتے ہو، یا کان کے پردے پر ہوا کے صدمے سے سنتے ہو۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔ یہ عالم مثال ہے۔ اس کے احکام، عالم شہادت و مادّی دنیا کے احکام سے بالکل جدا ہیں۔ نوم بے اختیاری (یعنی نیند کی کیفیت میں خود بخود چلے جانے) سے آدمی خواب دیکھتا ہے۔ نوم اختیاری (یعنی نیند کی کیفیت کو اپنے اوپر طاری کرنے) سے کشف ہوتا ہے۔ عالم مثال سے اوپر اور اس سے زیادہ لطیف ایک اور عالم ہے۔ وہ عالم ارواح ہے۔

وہاں نہ صورت ہے نہ شکل۔ نہ طول ہے نہ عرض۔ ایک انانیت، خودی اور میں پن ہے، جس کے ساتھ حیات، علم (اور) قدرت لگے ہوئے ہیں۔ ہر ایک انا دوسرے انا سے ممتاز ہے۔ اگر سب کی انا ایک ہی ہوتی تو سب کا ایک ہی ادراک ہوتا۔ علم و احساس ہوتا۔ جو ایک پر گذرتی، دوسرے کو بھی اس سے واقفیت ہوتی۔ مگر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ یہ انا اور اس کے لوازم کُن سے یکون ہوتے ہیں۔ یہاں مراتبِ خارجی اور مخلوقات کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ یہاں تک جتنے عوالم ہیں حوادث اور مرکبات ہیں۔ اب آگے مراتبِ داخلی، بسائط اور قدما ہیں۔ یہاں تک ذواتِ کثیرہ تھے۔ اب ذاتِ واحدہ ہے اور اس کے اسما و صفات ہیں۔ یہاں تک موجودات بالعرض تھے۔ فیضِ مقدس سے موجود تھے۔ اب ایک ذات ہے جو موجود بالذات ہے۔

آخر روح میں بھی حیات و علم و قدرت کہاں سے آئی۔؟ آئی بھی تو یہ حدوث کیسا۔؟ حادث و قدیم کا ربط کیسا۔؟ تعلق کس طرح۔۔۔؟ بات یہ ہے کہ ذاتِ الٰہی ہے، اس کی حیات و علم و قدرت ہے، علم کے ساتھ معلومات ہیں، جو قبلِ کُن ہیں۔ جن کا نام 'اعیان ثابتہ' ہے۔ جو علم میں موجود ہیں مگر خارج میں موجود نہیں۔ ہر عین ثابتہ پر اسما و صفاتِ الٰہی کی تجلی ہوتی ہے۔ عین ثابتہ، حقیقتِ کونیہ (اور) ماہیتِ ممکنہ پر جو نام دو، اس کی استعداد و قابلیت و فطرت کے مطابق تجلی ہوتے ہی وہ کُن سے فیکون ہوتا ہے۔ اعیان ثابتہ قدیم، اسما و صفاتِ الٰہی قدیم، ان کے روابط و تعلقات کا پروگرام (یا) وقت نامۂ عالم قدیم، مگر ہر شئے بعدِ ظہور۔۔۔ حادث۔۔۔ مثلاً تانبا سرخ عنصر، قدیم۔ جست خاکستر گوں، قدیم۔ مگر ان کا مرکب پیتل زرد، حادث۔۔۔ ڈرامے، قدیم (مگر) ناٹکوں میں کھیل کا ظہور، حادث۔ جلسوں کے وقت نامے (یا) نظام العمل، علم کی حد تک قدیم (مگر) جب عمل اس علم کے ساتھ آکر لگتا ہے (تو) ہر وقت ظاہر ہونے والا جزئی فعل، حادث۔ غرض یہ کہ تجلیاتِ الٰہی، روح الارواح ہیں۔ ہم، ہماری روح بعدِ کُن، حادث۔ تجلیِ حیات (اور) علم و قدرت قدیم، (مگر) ممکن کی حیات (اور) علم و قدرت، نمایاں و پیدا۔۔۔ (یعنی حادث)۔

شیخؒ کہتے ہیں: اسما و صفات الٰہیہ کی تجلی سب پر پڑتی ہے، مگر ان کا انعکاس ہر ایک کی حقیقت، ہر ایک کے عین ثابتہ کے موافق ہوتا ہے۔ جمادات میں ان کی حقیقت کے موافق، نباتات میں ان کی طبیعت کے مطابق، حیوانات میں ان کی ماہیات کے مناسب (اور) انسان میں اس کے حسبِ حیثیت۔ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، (یعنی) آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں، (الحشر:۲۴)۔ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَـٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ، (یعنی) کوئی شئے ایسی نہیں جو تسبیح و تحمید نہ کرتی ہو، مگر تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، (الاسراء:۴۴)۔ غرض یہ کہ جیسی قابلیت ہوتی ہے ویسی صورت آتی ہے۔ جیسی استعداد ہوتی ہے، اسما و صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر شوہر و بیوی کے تعلقات زمانۂ جنگ میں ہوتے ہیں تو لڑکے اور

سپاہی زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ آرام و راحت کے زمانے میں عورتیں اور نازک آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے تصورِ دل کا اثر اولاد پر پڑتا ہے۔ خوبصورت اشیا ماحول میں ہوں تو اولاد بھی حسین ہوگی۔ غرض ماں باپ کے تخیل کا اثر اولاد پر ہوتا ہے۔

شیخؒ کہتے ہیں: جس میں روحانیت کا غلبہ ہوتا ہے ان کی ہر چیز میں حیات کا جلوہ رہتا ہے۔۔۔ ان کی خاکِ قدم میں بھی حیات رہتی ہے۔۔۔ چناں چہ (فرعون کے جادوگر) سامری نے (بھی) جبرئیلؑ کی خاکِ قدم کو گوسالۂ طلائی (یعنی سونے کے بچھڑے) میں ڈالا تو وہ آواز کرنے لگا۔ اس میں سے بھی آثارِ حیات نمایاں ہونے لگے۔

(نوٹ: موسیٰ علیہ السلام کے پاس جب جبرئیلؑ تشریف لاتے تو روایت ہے کہ ان کے گھوڑے کا سُم جہاں بھی پڑتا وہاں کی زمین ہری ہو جاتی۔ سامری نے اسی "خاکِ قدم" کو استعمال کیا۔۔۔ مرتب)

تکوین (یعنی تخلیق) کے اقسام اربعہ یہ ہیں: ۱) ماں باپ سے، جیسے عام طور پر ہوتا ہے۔ ۲) بغیر ماں باپ کے، جیسے آدم علیہ السلام۔ ۳) بغیر باپ کے، جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا بی بی مریم سے پیدا ہونا۔ ۴) بغیر ماں کے جیسے امی حوا کا آدمؑ سے پیدا ہونا۔

شیخؒ فرماتے ہیں (کہ) حضرت عیسیٰؑ میں روحانیت کا غلبہ تھا اس لیے احیاے موتیٰ {مردے زندہ کرنا} اور لاعلاج بیماریوں کو شفا دینا (ان کے معجزات میں سے تھے اور ایسے ہی) بکثرت معجزات ان سے نمایاں ہوتے تھے۔ چوں کہ ان کی تخلیق میں باپ کو دخل نہ تھا۔ ماں ہی ماں تھیں لہٰذا ان کی طبیعت میں بہت نرمی اور نرم دلی تھی۔ (آپ) حکم دیتے تھے کہ اگر کوئی تمھارے رخسار پر ایک طمانچہ مارے تو تم اپنا دوسرا رخسار پیش کرو کہ ایک طمانچہ دوسرے رخسار پر بھی مارے۔ یہی عیسیٰؑ جب قربِ قیامت میں نزولِ اجلال فرمائیں گے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے جائیں گے تو جزیہ بھی لیں گے اور خنزیر کو قتل بھی کریں گے۔

شیخؒ فرماتے ہیں (کہ) جمع ہمت دل اور ہمہ تن توجہ الی اللہ سے اسی کے لائق اثر آتا ہے۔ روحِ الٰہی اور قوت ملتی ہے۔ فیض ملتا ہے۔۔۔ پس مرشد کی صحبت میں بیٹھیں (اور) خطرات دل سے دور کر کے ہمہ تن متوجہ الی اللہ ہو کر بیٹھیں تو فیض ملتا ہے۔ ہر شخص میں سے ایک قسم کا تموج ہوتا ہے۔ نیک سے نیکی کا، بد سے بدی کا، بار بار کی صحبت سے کچھ نہ کچھ اثر ہو ہی جاتا ہے۔ مرشد بھی ہمہ تن متوجہ ہو کر پوری ہمت یا پوری قوتِ ارادی کو (یعنی) اپنے وِل پاور (will power) کو ڈالے تو مرشد کے خیالات (اور) اخلاق مرید میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

تمثل: ہر معبر، (یعنی) خواب کی تعبیر بتانے والا، جانتا ہے کہ معانی اور ایسی چیزیں جو مرئی نہیں (یعنی بظاہر دیکھی نہیں جاسکتیں) وہ خواب میں دیکھنے والے کے لیے مناسب صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ چوں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، بشری تھی لہٰذا جبرئیل علیہ السلام کو صورتِ بشری اختیار کرنی پڑی، جو تمام

صورِ مخلوقات سے افضل و اعلیٰ تھی۔ اگر جبرئیلؑ، نفخ روح (یا روح پھونکنے) کے وقت بشری صورت کے سوائے کوئی اور صورت لیتے تو عیسٰی علیہ السلام کو بھی معجزات {احیاے میت وغیرہ} کے وقت وہی صورت اختیار کرنی پڑتی۔ کیوں کہ عالم میں ان کا تصرف قوتِ جبریلیؑ سے تھا۔ ظاہر ہے کہ گفتگو، بات چیت اور کلام سے کلمہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا کُن کے کلام سے جو کچھ پیدا ہوگا وہ کلمہ ہی ہوگا۔ چناں چہ تمام مخلوقات کُن سے پیدا ہوئے ہیں اور کلمۃ اللہ ہیں۔ اسی طرح کسی شئے میں آثارِ حیات اور علم و قدرت اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتے جب تک اسما و صفات الٰہیہ کا پرتَو اس کے عین ثابتہ (اور) اس کی حقیقت پر نہ پڑے۔ اور کوئی شئے پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس پر تجلّی اسمائی نہ ہو۔ لہٰذا ہر شئے کی ایک روح ہے جو منجانب اللہ ہے۔ جب ہر شئے کلمۃ اللہ ہے اور ہر شئے میں روح اللہ ہے تو جناب عیسٰی علیہ السلام کو کلمۃ اللہ یا روح اللہ کہنے کی کیا خصوصیت ہے۔۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے اور ان کی جانبِ روحانیت قوی، اور جانبِ جسمیت ضعیف تھی اس لیے ان کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہا گیا۔۔۔ طریقہ یہ ہے کہ اُن چیزوں کو جن میں جانبِ روحانیت قوی ہو، منسوب الی اللہ کیا جاتا ہے۔ تمام گھر خدا ہی کے ہیں، مگر چوں کہ کعبہ شریف میں روحانیت اور پرتَو تجلیاتِ الٰہی ہے لہٰذا اس کو بیت اللہ کہا گیا۔

شیخؒ فرماتے ہیں: عیسٰی علیہ السلام میں دو جہتیں ہیں۔ (۱) جہت نفخ جبرئیلؑ۔ اس لحاظ سے معجزات ہوتے تھے۔ اور چوں کہ جبرئیلؑ بشری صورت میں تھے لہٰذا عیسٰی علیہ السلام کو وقتِ معجزہ (کبھی) صورت بدلنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اگر جبرئیلؑ بشری صورت میں نہ ہوتے، کسی اور صورت میں ہوتے، تو حضرت عیسٰی کو بھی وہی صورت اختیار کرنی پڑتی۔ (۲) اعطاے اولاد (یعنی اولاد کا دینا) (اور) احیاے اموات (یعنی مردوں کو زندہ کرنا)۔ ظاہری صورتِ عیسٰیؑ کے لحاظ سے حقیقت ہے، اور باطن کے لحاظ سے حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اور مجازاً عیسٰی علیہ السلام کے لیے۔ دیکھو! قرآن شریف میں حضرت جبرئیلؑ کا قول (ہے)، لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا، (یعنی) میں تم کو پاکیزہ بیٹا دوں، (مریم:۱۹)۔ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي، [(یعنی) تم میری (یعنی اللہ کی) اجازت سے مردوں کو نکالتے ہو (زندہ کرتے ہو)، (المائدہ:۱۱۰)]۔ یہاں ظاہر کا لحاظ کر کے بیٹا دینے کی نسبت، جبرئیلؑ نے اپنی طرف کی۔ اور اللہ تعالیٰ نے احیاے موتیٰ کی نسبت، عیسٰیؑ کی طرف (کی)۔ بعض نادان اس طرح مجازی نسبت کرنے کو کفر سمجھتے ہیں۔

شیخؒ فرماتے ہیں: احیاے میّتِ جسمانی تو ظاہر ہے، یعنی تنِ مردہ کو زندہ کرنا۔ ایک احیاے معنوی ہے، یعنی دلِ مردہ کو علم دینا اور اس کو زندہ کرنا۔ جو شخص اپنے شاگرد کو معرفتِ الٰہی کے متعلق ایک مسئلہ بھی سمجھاتا ہے، اس کو تعلیم دیتا ہے۔ وہ بھی احیاے میّت کرتا ہے۔ اک نور دیتا ہے، چراغ دیتا ہے۔ جس کو لے کر وہ لوگوں کے سامنے نکلتا ہے۔

نفس رحمانی: یہ پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ تمام مخلوقات امر کُن سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کلمۃ اللہ ہے۔ اب ذرا اس پر بھی غور کرو کہ ہمارے منہ سے الفاظ و کلمات کس طرح نکلتے ہیں۔ ہم سانس لیتے ہیں، ہماری سانس کی ہوا مختلف مقامات سے (یعنی) مختلف مخارج پر سے گزرتی ہے تو منہ سے لفظ یا کلمہ نکلتا ہے۔ بلا تشبیہ فیضِ الٰہی سے لفظ "کُن" بھی مختلف اسما و صفات پر سے گزرنے کے بعد نمایاں و مشہود ہوتا ہے۔ اس کو کلمۃ اللہ اور مخلوق کہتے ہیں۔ یہ فیض، یہ وجودِ بخشی، دائماً جاری و ساری ہے اور اسی کو نفسِ رحمانی کہتے ہیں۔ شانِ رحمان، اللہ تعالیٰ کی ایک کلّی و عالمگیر صفت ہے جو سارے عالم پر اثر فرما ہے۔ جس سے کافر و مسلمان دونوں مستفید ہو رہے ہیں۔ مسلم کو بھی وجود مل رہا ہے اور غیر مسلم کو بھی۔ ہر ایک کو جزئی طور سے بلحاظ خصوصیات جو فیض پہنچ رہا ہے، اس کو رحیمیت کہتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمانی کا ظہور ہے کہ کافر و مسلم سب کو حصہ مل رہا ہے۔ اور رحیمیت کا ظہور آخرت میں ہوگا اور وہ مسلم و مطیع سے مخصوص ہے۔ کافر و عاصی کو اس میں حصہ نہیں۔ غرض یہ کہ رحمان میں الفاظ زیادہ ہیں تو معنیٰ میں بھی ہمہ گیری ہے۔

شیخؒ، ملائکہ کی تقسیم (یوں) کرتے ہیں: ۱) ملائکہ عنصری، ملکوتِ اسفل و مدبرِّ عناصر۔ ۲) ارواح علوی، سماوات والے۔ ۳) ملائکہ طبعی ملأالاعلیٰ والے، منتظمین عالم۔ ۴) مہیمین، عالین، حضارِ دربار الٰہی میں محو و مستغرق۔ شیخؒ کا خیال یہ ہے کہ یہ ملائکہ چوں کہ محو و مستغرق فی العبادۃ (کل وقتی عبادت میں) ہیں لہٰذا ان کو آدم کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ انھوں نے نہ خلقِ آدم پر اعتراض کیا (اور) نہ ہی علمی مقابلہ کیا۔ شیخؒ کے خیال میں (ایسے) ملائکہ علیین، آدمؑ سے افضل ہیں۔ غالباً یہ خیال نوریت اور قربِ الٰہی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ انسان اللہ تعالیٰ کا مظہر تام ہے، خلیفۃ اللہ ہے، عبدِ جامع ہے۔ کسی فرشتے نے حقیقتِ انسانیہ کے سوا دیکھا ہی کیا (ہے)۔ انا من نوری اللّٰہ وکلھم من نوری، [(یعنی) میں اللہ کے نور سے ہوں اور سب کچھ میرے نور سے ہے (حدیث۔ کتب الصوفیہ)]۔ مہیمین یا ملائکہ علیین، حقیقتِ محمدیہ کے نور سے پیدا ہوئے۔ اور اسی کے جمال میں محو و مستغرق ہیں۔

شیخؒ فرماتے ہیں: لما قام لھا الحق فی مقام حتیٰ نعلم و یعلم استفھمھا، (یعنی) جب حق تعالیٰ مقام حتیٰ نعلم و یعلم میں قائم ہوا تو {عیسیٰ کلمۃ اللہ} سے پوچھا۔۔ حتیٰ نعلم سے اشارہ ہے آیت، حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ، (کی طرف)، (یعنی) تاکہ ہم جان لیں تمھارے میں کے مجاہدین اور صابرین کو، (محمد:۳۱)۔ (اور) یعلم سے اشارہ ہے (آیت)، وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّـهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ، (کی طرف)، (یعنی) اور ابھی تک اللہ کو معلوم نہیں ہوئے وہ لوگ جو تم میں سے جہاد کرتے ہیں، (ال عمران:۱۴۲)۔۔۔ ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو پہلے علم نہ تھا پھر اس کو علم آیا۔۔ اور یہ حدوثِ علم ہے۔۔ اس مسئلے کی تحقیق ہم بہت ہی مختصر طریقے پر کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے صفات تین قسم کے ہیں۔ ۱) صفاتِ حقیقیہ جو ذات کی اصلی و ذاتی صفت ہے۔

اس میں دوسری شئے کا بالکل لحاظ نہیں، جیسے حیات، کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے۔ اس میں مخلوقات کا لحاظ کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ ۲) حقیقیہ ذاتِ اضافت یا حقیقیہ اضافیہ، یعنی وہ صفات جو ہیں تو حقیقی مگر ان کو اضافت عارض ہوتی ہے۔۔ جیسے علم، کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفت ہے مگر ایک قسم کی اضافت بھی اس کو لگ جاتی ہے، جیسے اللہ کا خود کو جاننا، بندوں کو جاننا۔ ۳) صفت اضافیہ محضیہ (یعنی) نری اضافی صفت، جس کا موصوف میں مبدأ نہیں۔ کوئی منشا کوئی مادّہ نہیں۔ میں زید سے مقدم ہوں، پہلے (اور) آگے ہوں، یا مؤخر اور بعد (اور) پیچھے۔ آگے پیچھے کے لیے مجھ میں کوئی مادہ صفت قائم نہیں۔ بلکہ صرف دوسرے کو دیکھ کر، اس کے لحاظ سے ایک صفت لگا دیتے ہیں۔ اضافیہ محضیہ کے بدلنے سے اس کے حدوث سے ذات پر حدوث کا اثر کچھ نہیں ہوتا۔

اب ذرا علم پر بھی غور کرو۔ علم الٰہی تین قسم پر ہیں:

۱۔ علم ذاتی: خدائے تعالیٰ کا خود کو جاننا۔ اس مرتبے میں وہ خود ہی عالم ہے، خود ہی علم ہے، خود ہی معلوم ہے۔ چوں کہ سب کا منشا، سب کی اصل ہے اس لیے خدائے تعالیٰ کا خود کو جاننا سب کو جان لینا ہے۔

۲۔ علم فعلی: خدائے تعالیٰ کا تمام اشیا کو قبل خلق و کُن ایک دوسرے سے ممتاز طور پر جاننا۔ یہ مرتبہ، صفت کا ہے۔ اس مرتبے میں معلومات کو اعیان ثابتہ کہتے ہیں۔ اسی مرتبۂ علم پر عدم اضطرار کا، اختیار کا دار و مدار ہے۔ اگر یہ علم نہ ہو تو اشیا بے علمی سے، بے اختیاری سے، پیدا ہوں گے۔

۳۔ علم انفعالی: خدائے تعالیٰ کا بعد خلق، بعد کُن خارج میں ممکنات کو موجود کر کے، پیدا کر کے جاننا۔ اسی علم انفعالی میں علم کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں (کہ) علم انفعالی، صفت اضافیِ محضہ ہے۔ اس کے حدوث سے ذاتِ الٰہی پر حدوث کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا علم انفعالی حادث ہو تو ہو جائے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ علم الٰہی تو قدیم ہے۔ مگر اس کا تعلق شئے حادث سے ہونے سے حادث ہے۔ بہر حال علم قدیم اور تعلق حادث ہے۔ حتیٰ نعلم و یعلم سے حدوثِ تعلق مراد ہے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ جو دائرۂ امکان سے خارج ہے۔ اس کے سامنے سب کچھ حاضر ہے۔ وہاں سابق لاحق (یعنی پہلے اور بعد) کی گنجائش نہیں۔ اللہ کے لحاظ سے کوئی اول نہیں، کوئی آخر نہیں۔ لہٰذا حتیٰ نعلم سے مراد علم رسول ہے، جو خلیفۂ الٰہی ہے۔

شیخؒ کہتے ہیں: جب خدا کے سوائے کوئی موجود بالذات نہیں۔ کوئی عالم بالذات نہیں، تو جتنے ممکنات جانتے ہیں حقیقتاً ان میں سے خدائے تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ وہ اطلاق کے لحاظ سے قدیم ہے اور وہی تقئید و تعیین کے لحاظ سے حادث ہے۔ اسی طرح علم، قدیم میں قدیم ہے، اور حادث میں حادث۔۔۔ حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے اور ان کے ضمن میں ہم کو معلوم ہو جائے کہ تم میں سے کون مجاہد ہے اور کون خانہ نشین {حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ، (محمد:۳۱)}۔